ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کیا جوان اٹھّا ہے قیس کے گھرانے سے

اشفاق حسین نے ۱۹۸۰ء کے بالکل شروع میں کینیڈا ہجرت کی تھی یعنی ہمارے شہر میں وہ ۱۹۷۹ء تک مقیم رہے اور اب گزشتہ تیرہ سال سے کینیڈا کے خوب صورت شہر ٹورنٹو میں ایک کینیڈین شہری کی حیثیت سے شاندار زندگی گزار رہے ہیں اور جس کا میں خود عینی گواہ ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھے وہاں دوبار جانے کا موقعہ ملا۔

وہاں جانے سے قبل وہ کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کر چکے تھے اور دو کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ''فیض ایک جائزہ'' اور ''اعتبار''۔ اول الذکر ان کا تحقیقی مقالہ تھا جو ۱۹۷۷ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ یعنی وہ وہاں جا کر شاعر اور ادیب نہیں بنے بلکہ ہمارے ہی شہر کی ادبی فضا نے ان کے ادبی شعور کو جلا بخشی۔

اشفاق ۱۹۷۰ء بلکہ اس سے چند سال پہلے ہی فیض احمد فیض کو دل دے بیٹھے تھے اور فیض سے عقیدت ہی نے انہیں مجبور کیا ہوگا کہ وہ فیض کے ماہ و سال کے آئینہ میں تخلیق اور پسِ تخلیق عوامل کا جائزہ لیں۔ ایم اے کے ایک طالب علم کی استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے جب میں نے پہلی بار ان کی کتاب پڑھی تھی تو مجھے یہ کتاب واقعی بہت اچھی لگی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت پر اشفاق نے مجھ سمیت اپنے تمام دوستوں اور مبصروں سے بھرپور داد حاصل کی تھی۔ اس مقالے میں گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی اور فیض کی شاعری کے بنیادی حوالوں تک رسائی حاصل کرنے کی

قابل داد کوشش بالکل واضح تھی- ایک بات اور' اشفاق حسین کی یہ کتاب اپنی طباعت کے ساتھ ہی فیض احمد فیض پر اردو میں پہلی باقاعدہ کوشش قرار پائی- اس طرح اشفاق حسین کو جس اولّیت کا شرف حاصل ہے وہ فیض احمد فیض پر اردو یا کسی اور زبان میں فیض پر لکھی جانے والی پہلی کتاب کے مصنف ہونے کا بھی ہے اور کیا یہ کم حیرت کی بات نہیں کہ یہ سعادت انہیں صرف ۲۶ سال کی عمر میں حاصل ہوئی- بلکہ جس زمانے میں انہوں نے یہ مقالہ لکھا تھا تو اس وقت تو ان کی عمر صرف ۲۳ سال کی تھی- اختصاص کا یہ سورج بہت کم لوگوں کے سروں پر طلوع ہوتا ہے اور اشفاق ان ہی کم نوجوانوں میں سے ایک ہیں-

فیض احمد فیض اور اشفاق حسین کے باہمی تعلق میں ۱۹۷۷ء کے بعد کافی اضافہ ہوا- یہ صرف فرینڈ شپ ہاؤس اور آرٹس کونسل سے منصبی تعلق کی وجہ سے فیض صاحب سے رسم و آشنائی والی بات نہ تھی بلکہ فیض صاحب جس نوجوان شاعر کو اس کی کینیڈا ہجرت کے وقت تک اچھی طرح پہچانتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے وہ اشفاق حسین ہی تھے-

۱۹۸۰ء میں اشفاق حسین کی کینیڈا منتقلی کے بعد جب مغربی دنیا سے اردو کا سب سے معتبر سہ ماہی رسالہ ''اردو انٹرنیشنل'' اشفاق حسین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تو اس رسالے پر فیض احمد فیض کا نام سرپرست کے طور پر شائع ہونے لگا- یہ معاملہ خالی خانہ پری کا نہیں تھا بلکہ اس میں فیض صاحب کی رضا و رغبت کا بھی دخل تھا- اشفاق اور اردو انٹرنیشنل کو یہ فخر حاصل ہے کہ فیض احمد فیض نے اپنے دوستوں سے اس رسالے کے لیے قلمی معاونت کے لیے متعدد خطوط بھی لکھے جن میں اشفاق سے اپنے تعلق کا اظہار بھی کیا گیا ہے- اور پھر فیض صاحب جب بھی کینیڈا تشریف لے گئے تو اشفاق اور ان کے حلقہ احباب کے لوگ فیض صاحب کے میزبان ہوا کرتے تھے- مہمان ان سے اور وہ مہمان سے اس قدر خوش رہا کرتے تھے کہ میزبان میں مہمان کی زندگی اور فن پر تحقیق کی سمائی اور اشفاق حسین تو فیض

صاحب پر اب با قاعدہ Authority تسلیم کیے جانے کے لائق ہیں- اور میرا یہ دعویٰ ایسا کچھ بغیر دلیل کے بھی نہیں ہے کہ اسے صرف دوست نوازی کے زمرے میں ڈال کر سرسری گزر جایا جائے- یہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی پہلی کتاب ''فیض ایک جائزہ'' کے بعد ہزار صفحات پر مشتمل ''فیض کے مغربی حوالے'' اور تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل ''فیض حبیب عنبر دست'' کے مصنف کی حیثیت سے ان کتابوں کی تقریبِ رونمائی کی محفل میں آج یہاں ایک مہمان ادیب کے طور پر موجود ہیں- آج وہ اسی آرٹس کونسل میں دولھا بنے ہوئے ہیں جس کے وہ ۱۳ سال قبل پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کارگزار تھے-

اشفاق' اردو انٹرنیشنل کے پانچ سال تک مستقل نکلنے والے رسالے کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نظموں کے ایک انتخاب That Day Will Dawn کے علاوہ اپنے شعری مجموعوں 'اعتبار' اور 'ہم اجنبی ہیں' اور فیض صاحب پر اپنی کئی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے آج ساری اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں-

میں اشفاق حسین سے خطوں کے جوابات دینے میں تساہلی پر اکثر و بیشتر نالاں رہا کرتا تھا لیکن فیض پر ان کی کتابوں اور تازہ ترین شعری مجموعے ''ہم اجنبی ہیں'' کو دیکھتا ہوں تو سب کے سامنے ان سے اپنی شکایتیں واپس لیتا ہوں- اب میرے خطوں کے جوابات نہ دینے کا ان کے پاس بہر حال ایک جواز تو ہے-

اشفاق حسین نے اپنے موضوع سے انتہائی دلچسپی کا ایک اور ثبوت فراہم کیا ہے کہ کراچی سے اپنے پہلے مجموعے ''اعتبار'' جو یقینی طور پر اعتبار کی منزل پر فائز تھا' کی اشاعت کے بعد' جو ۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے اور ملک میں تیسرے مارشل لا کے دور کی ذہنی اور قلبی واردات کا عکاس بھی ہے' اب تقریباً ۱۲ سال کے بعد ان کو یہ فرصت اور ہمت نصیب ہوئی کہ وہ فیض احمد فیض پر اپنے بھرپور کام کے بعد اپنے

اندر کے بے قرار شاعر کی بپتا کو بھی ان قارئین کے سامنے پیش کریں جو اُن کے مستقبل سے بہت اچھی توقعات لگائے بیٹھے تھے۔

میں بھی ان کا ایک قاری اور سامع ہوں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قاری کم اور سامع زیادہ۔ اس زمانے سے جب وہ مرحوم قمر عباس ندیم کے حلقہ میں شامل ہوئے تھے اور قمر عباس ندیم کے حلقے کا ہر فرد میرے لیے ہم مسلک ہونے کے ناطے بمنزلہ بھائی کے ہے۔ اشفاق حسین ابھی تک اپنے ادبی کیریر کے ان ابتدائی دنوں کو نہیں بھولے جب انہیں واللہ عالم کیوں اپنے شاعر اور ادیب ہونے پر یقین نہ آیا کرتا تھا اور ان کے قریبی دوست جن میں خود میں بھی شامل تھا اپنی اس رائے میں کسی بھی قسم کی ترمیم کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ وہ اول و آخر شاعر ہی نہیں بلکہ ایک Promising Poet ہیں۔

اُن دنوں وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ Bohemian ہونے کی شرط بھی پوری کرتے تھے۔ اُس حد تک نہیں جتنے ہمارے دوست اور بھائی جون ایلیا ہیں۔ لیکن اُس دشت کی سیاحی کی کچھ خاک ان کے سر پر بھی نظر آتی تھی۔ لیکن اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انہیں اور ان کے بہت قریبی اور بے تکلف دوستوں ہی کو ان کے Bohemianism کی دلچسپ روئدادیں یاد ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ذہنی طور پر اب بھی خود کو اسی دنیا کا باشندہ سمجھتے ہیں جہاں وہ ستر کی دہائی تک تھے۔ چلیے اب وہ اُس طرح کے نہ سہی مگر ان روئدادوں کے ذکر پر اب بھی اپنا پرسر دھنتے ہیں اور ان روئدادوں کو سنانے والے ان کے سب دوست ان سے اپنے حافظے کی داد چاہتے ہیں کہ ۱۹۸۰ سے ۹۲ء تک ان کے دوستوں پر یہاں جو کچھ بیتی ہے وہ اتنی بہت کچھ ہے کہ بقول مرحوم اطہر صدیقی:

ہمارا حال سرِ راہ پوچھنے والے
ہمارا قصۂ غم اتنا مختصر بھی نہیں

لیکن اشفاق حسین نے اپنی تحقیقی کتاب کے لیے فیض احمد فیض کا انتخاب کر کے اور اسے مغربی حوالوں کے تناظر میں دیکھ کر فیض کی جلاوطنی کا وہ دور بطور ایک ایمگرنٹ خود بھی جھیلا ہے اور ہجرت کے ذاتی تجربے کا ذائقہ ان کے ہونٹوں پر آج بھی ہے۔

اشفاق حسین اسی شہر میں ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ کراچی یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے اور گلشن اقبال کے علاقے میں منتقل ہونے سے قبل کورنگی میں رہا کرتے تھے۔ اس بستی کا خیال مجھے یوں بھی آیا کہ محافلِ شبینہ کی سرمستیوں میں اشفاق اکثر و بیشتر' کورنگی کے لیے جانے والی آخری بس کا وقت بھول جایا کرتے تھے اور شعر سنتے سنتے یا سناتے سناتے اپنے قریبی دوستوں کے یہاں شعر بسری اور شب بسری دونوں کی لذتوں سے شاد کام ہوا کرتے تھے۔ اب نہ وہ دن ہیں جو پُر ماجرا راتوں کے لیے گزرا کرتے تھے اور نہ وہ راتیں ہیں جن پر دن کا گمان ہوا کرتا تھا۔ اشفاق کے اس وقت کے دوستوں میں مجاہد بریلوی' سید جعفر احمد' عابد اظہر' باقر جعفری' رضی مجتبیٰ اور قمر عباس ندیم مرحوم ہوا کرتے تھے۔ قمر عباس اُن سب کے سینیر تھے اور ہمیں اور ہمارے گروپ کے اس وقت کے راحت سعید' جون ایلیا اور حسن عابد کو قمر عباس کے بزرگ دوستوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ میں قمر کے بزرگ دوست ہونے پر پچھتایا کرتا تھا کہ زندگی کا اصل مزہ تو قمر عباس کے نوجوان دوست اٹھا رہے تھے۔ ہر چند کہ ہمارے جونیر اور سینیر کے الگ الگ دائرے تھے لیکن یہ تمام دائرے ایک دوسرے کو کاٹنے کے بجائے ساتھ ساتھ اور متوازی چلتے تھے۔ ان تمام دائروں کے نظریاتی ساتھیوں کی باہمی محبت اور احترام نے ان دائروں میں ایک ایسی فکری فضا پیدا کر دی تھی جس کے اندر رہ

کر مظلومیت اور مظلوموں سے پیار ہی حسن تھا، مکمل خیر تھا اور ادبی رجحانات کا محور بھی تھا۔

آج کی شام بیک وقت تین کتابوں کی رسمِ اجرا ہے لیکن میں سب سے پہلے اشفاق حسین کے شعری مجموعے ''ہم اجنبی ہیں'' کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ میں برسوں پرانے کہے ہوئے اپنے جملے کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اشفاق اوّل و آخر شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''اعتبار'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس سے دو سال قبل روزنامہ ڈان میں اپنے کالم ''لٹریری راؤنڈ اپ'' میں پورے سال کا ادبی جائزہ لیتے ہوئے میں نے کراچی کے جن چند نوجوان شاعروں کے بہتر مستقبل کے بارے میں بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں ان میں اشفاق حسین کا نام بھی شامل تھا۔ اس نام کی شمولیت پر میرے کچھ ہم عصروں نے اعتراض بھی کیا تھا کہ اشفاق کا تو اب تک کوئی شعری مجموعہ بھی نہیں شائع ہوا ہے تو آپ نے ان کا ذکر اتنی فراخدلی سے کیوں کیا ہے؟ اس وقت میرا جواب یہی تھا کہ ہر چند وہ ادبی پرچوں میں باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتے ہیں لیکن میں نے اشفاق کی شاعری کو سنا ہے بلکہ مستقل سنتا رہتا ہوں اس بنیاد پر میں نے رائے قائم کی ہے اور میں اس میں قطعی کوئی تبدیلی کرنے کے حق میں نہیں ہوں تا وقتیکہ خود اشفاق مجھے مایوس کر دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور ان کے پہلے مجموعہ کلام ''اعتبار'' کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ مسندِ اعتبار پر فائز ہو چکے تھے۔

''اعتبار'' کی شاعری ایک نوجوان ترقی پسند شاعر کے آغازِ شباب کی شاعری تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عمر کے انداز ہی کچھ اور ہوتے ہیں، رنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس نسل کے جو سیاسی اعتبار سے ترقی پسند ہونے کے ساتھ اپنے بزرگوں سے غصیلے نوجوانوں Angry Young men کی طرح برتاؤ کر رہی تھی۔ اس نسل کے نوجوانوں نے زندگی کے ہر میدان میں اپنے بزرگوں کی ہٹ دھرمی، روایتی اور معروضی طور پر مہذب اقدار سے روگردانی اور فیوڈل معاشرے کی کوتاہ نظری کے باعث خود کو

جس گرداب میں پھنسا ہوا پایا تھا وہ انہیں واضح طور پر سماجی حوالے اور اس کے پس منظر سے Non Conformist- بنائے جا رہا تھا جو بہر حال ایک مثبت رویہ نہیں تھا- لیکن اسی دور میں اشفاق حسین نے اس بے یقینی کی فضا میں بھی یقین و اعتبار کے پھولوں کی کاشت کی-

۱۹۸۰ء میں کینیڈا کا سفر اور وہیں مستقل قیام کی غرض سے باشندگی نے ایک طرف ان کو نئی دنیا کے چیلنجز سے نبرد آزما کیا اور دوسری طرف مغربی تہذیب کے اس illusion کا بیک وقت معترف اور نقاد بھی بنایا کہ وہاں لاطبقاتی سیات ممکن ہے- بات صرف یہاں تک ٹھہری کہ مغربی معاشرہ انفرادی سطح پر اپنے افراد کے لیے صفاتی طور پر زیادہ concern ہے جس کا ہمارے لیے یہ مطلب ہوا کہ وہ زیادہ پُر تپاک بھی ہے- اشفاق ایک ایسے معاشرے سے مغربی دنیا کے ایک ترقی یافتہ ملک منتقل ہوئے تھے جہاں بے پناہ ترقی کے باوجود Art کے لیے ایک نرم گوشہ ہی نہیں بلکہ تپاک بھی موجود تھا- بعض حضرات کا خیال ہے کہ آرٹس کی ترقی مغربی معاشرہ کی ناگزیر مجبوری ہے جب کہ ہم اپنے معاشرے کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو چکے ہیں کہ آرٹس کے ساتھ سرد مہری' لاتعلقی بلکہ دشمنی ہی ہمارے معاشرہ کی مجبوری ہے- جس ملک میں تعلیم جیسے شعبہ پر کینیڈین باشندے کے باتھ رومز کے لیے Tissue Papers پر ہونے والے خرچ سے کم رقم خرچ ہوتی ہے وہاں میرے دوستو' زندہ رہنا بذاتِ خود ایک عبادت ہے-

اشفاق حسین کا دوسرا مجموعہ کلام ''ہم اجنبی ہیں'' ۱۲ سال بعد شائع ہوا ہے- اس دوران انہوں نے اردو انٹرنیشنل کینیڈا کے شاید ۱۳ یا ۱۴ خوب صورت اور معیاری شمارے نکالے' اپنی شاعری کا انگریزی ترجمہ That Day Will Dawn شائع کیا- چندی گڑھ ہندوستان سے ان کی نظموں کا ترجمہ ''نیندر نال رشتہ'' کے نام سے شائع ہوا اور آج کی شام وہ اپنی تین نئی کتابوں کے ساتھ یہاں

موجود ہیں- یہی نہیں اس دوران پاکستان اور ہندوستان اور یورپ کے دسیوں چکر بھی لگائے- یوں لگتا ہے کہ اشفاق حسین جو کبھی آرٹس کونسل آف پاکستان کے پروگرام آفیسر ہوا کرتے تھے اب آرٹس کونسل کی طرف سے اردو زبان و ادب کی دنیا میں ''سفیر'' کا کردار ادا کر رہے ہیں-

اس کے باوجود اس خیال میں کسی حد تک صداقت بھی ہے کہ وہ ابھی تک ذہنی طور پر ہمارے ہی درمیان رہتے ہیں- آپ کینیڈا میں ان کے گھر میں ہوں یا وہ اپنے کراچی کے گھر میں ہوں یا دوستوں کے درمیان ہوں' لگتا یہی ہے کہ اشفاق ہمارے سماج کا ایک سیماب صفت حصہ ہیں جو اپنی جنم بھومی سے کٹ کر اجنبی ہونے کی سوہان روح تکلیف سے دوچار ہیں- اس تمّول کا جو اسے کینیڈا میں حاصل ہوا اور اس کوفت اور رنج کا جو اسے یہاں کے حالات پر ہے اگر Cost-Benefit Ratio نکالا جائے تو وہ اردو کلچر کے حق ہی میں جاتا ہے- اشفاق اگر کینیڈا نہ گئے ہوتے تو غالباً ان کی شامیں اتنی آزردہ نہ ہوتیں- اور وہ وقت کو گرفتار کرنے کے لیے اس قدر منصوبہ بند نہ ہو پاتے کہ شعری مجموعہ ''ہم اجنبی ہیں'' کے علاوہ فیض احمد فیض پر دو کتابوں جن کی مجموعی ضخامت تقریباً بارہ سو صفحات بنتی ہے اور ''فیض کے مغربی حوالے'' غالباً اردو کے کسی بھی جدید شاعر کے مغربی حوالوں کے پس منظر میں یہ وہ واحد تالیف ہے جو قابل داد بھی ہے اور قابل رشک بھی ہے- فیض صاحب کو اپنے مغربی ممالک کے دوروں میں جس قدر مزہ آیا ہوگا وہ مجھے کم از کم یہ کتاب پڑھ کر ہی آ گیا- اس کتاب میں ہزاروں سرمست راتوں کی دل آویزی اور کیف بند ہے-

رہا سوال ''فیض حبیب عنبر دست'' کا تو یہ اس بڑی کتاب کے کینیڈین چیپٹر کے مواد سے قدرے زیادہ پہلو دار کتاب ہے- ظاہر ہے اس کتاب کو ''فیض کے مغربی حوالے'' کی صرف مددگار کتاب بنانا تھا تاکہ دونوں مل کر فیض اور کینیڈا کے مابین باہمی رشتوں کی علیٰحدہ سے ایک دستاویز بن جائیں- ان

دونوں کتابوں کے ساتھ اشفاق حسین کے شعری مجموعے ''ہم اجنبی ہیں'' کی حیثیت کچھ ایسی ہے جیسے کہ اشفاق حسین فیض کی مشہور نظم ''دل من مسافرِ من'' میں جاری وساری sentiment سے قطعی مختلف نوعیت کے جذبہ نے اشفاق کو آ گھیرا ہو-

اشفاق کی کینیڈا کے دوران ِ قیام شاعری کا جمالیاتی ماحصل یہ ہے کہ ہجرت نصیبی بہر صورت افسوسناک ہے- خاص طور پر جبکہ یہ اختیاری بھی ہو لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے ملک میں نوجوانوں پر بہتر Opportunities کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور وہ شاید اسی لیے ہجرت کی 'شبِ غم' کے بجائے ہجرت کی 'شبِ زندگی' کی بات کرتے ہیں- ویسے اشفاق پر پاکستان میں بھی بہتر اپارچیونٹی کے دروازے مکمل طور پر کبھی بند نہیں ہوئے تھے- وہ اپنے سینکڑوں ساتھیوں کے مقابلے میں یہاں پر بھی خاصے خوش قسمت رہے ہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ان کے اس نئے مجموعے کی شاعری کا بنیادی حوالہ دو دنیاؤں کے مابین موازنہ ہے اور یہ موازنہ ہی ان کی شاعری کے حزنیہ خمیر سے خوب صورت تراکیب اور تمثالوں کا حیران کن جھرمٹ سامنے لاتا ہے-

اشفاق حسین نے شمالی امریکہ اور مغرب میں اردو شعری روایت کے اندر رہتے ہوئے واقعتاً بہت خوب صورت شاعری کی ہے جس پر نہ صرف وہ بلکہ ہم بھی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں- یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اردو شاعری کے گلستان میں ایک ایسی کھڑکی کھول دی ہے کہ جس سے تازہ ہوا کے جھونکے مسلسل آ رہے ہیں-

مثلاً ''ہم اجنبی ہیں'' کی پہلی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں-

کئی موسم گئے پر ہجرتوں کا دکھ ابھی تک ہے
یہ سناٹا مرے اندر کا میری زندگی تک ہے

سکوں ملتا ہے بے آنگن گھروں میں میرے بچوں کو
کھلے دالان کی خواہش تو میری نسل ہی تک ہے
یہ ٹوٹے لوگ' بکھرے لوگ' میرے لوگ ہیں جن کا
گئی تہذیب سے رشتہ غزل کی شاعری تک ہے-

اسی ہجرتی موضوع کا ایک اور رخ ملاحظہ کریں-

میزباں تہذیب کی نیرنگیاں ہیں اور ہم
کھوئی کھوئی سی عجب محرومیاں ہیں اور ہم
پہلے آجاتا تھا جن باتوں پہ غصہ بار بار
اب انہی باتوں میں کچھ دلچسپیاں ہیں اور ہم
کوئی چہرہ اب کسی کھڑکی میں یاد آتا نہیں
ساحلوں پر دھوپ لیتی لڑکیاں ہیں اور ہم

اور پھر یہ خیال بھی کافی دلچسپ ہے کہ:

دوسری ہجرت کی تیاری خود کو دھوکا دینا ہے
شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والا پھول بھلا کب مہکا ہے
وہ دنیا جو چھوٹ گئی اب اس دنیا کی باتیں کیا
جس میں آج اداس ہوئے ہم' اب وہ اپنی دنیا ہے

اس احساس کی بھی ایک بہت مضبوط اور بہت ہوشربا بنیاد ہے- یہ وہ سچ ہے جو اشفاق کی شاعری کی شعری صداقت بھی ہے اور اپنے وقت کی سیاسی صداقت بھی ہے-

ہم اجنبی ہیں یہاں پر مگر وطن سے کم
دھواں دھواں سا ہے منظر مگر وطن سے کم
شناخت اپنی ہم اک روز بھول جائیں گے
ہمیں ہے اس کا یہاں ڈر مگر وطن سے کم

ٹی ایس ایلیٹ نے امریکہ سے انگلستان واپس آ کر شام کے جھٹ پٹے میں اپنے آبائی دیہاتی گرجا کی ایک بنچ پر بیٹھ کر کہا تھا History is here and now - اشفاق بھی ''یہاں اور اب'' کی بات کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں ''اب'' پاکستان نہیں بلکہ کینیڈا ہے- شاید یہی ان کے اس مجموعے ''ہم اجنبی ہیں'' کے نام رکھنے کا جواز بھی ہے- بہر حال ان کے دوستوں نے انہیں ان کے اپنے وطن میں کبھی اجنبی نہیں سمجھا- ان کی غیر موجودگی میں بھی ان سے یہاں ٹوٹ کر محبت کی گئی ہے-

اشفاق حسین نے جس خوب صورتی سے کینیڈا کے نسلی ادب Ethnic Literature میں اردو شاعری کے نئے اظہاراتی پیکر تراشے ہیں وہ خواہ ہمارے لیے المناک حقیقتوں کے ترجمان ہی کیوں نہ ہوں لیکن بین الاقوامی اردو شاعری کا ایک ایسا رخ ضرور ہے جسے اشفاق حسین نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں بہت خوب صورتی کے ساتھ بیان بھی کیا ہے- جب احساس بحسنِ خوبی ' کلام کی منزل میں داخل ہو جائے تو پھر ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین ہی بلند ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے-

اشفاق' میں تمہاری محنت' لگن اور achievements کو دیکھ کر صرف یہی کہہ سکتا ہوں

کیا جوان اٹھا ہے قیس کے گھرانے سے

(آرٹس کونسل آف پاکستان' کراچی میں ۱۹۹۳ء میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)